ڈاکٹر روش ندیم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند نظم

Dr. Rawish Nadeem
Assistant Prof. Department of Urdu
International Islamic Unviersity, Islamabad.

Ahmed Nadeem Qasmee's progressive poetry

Progressivism is not a philosophy itself but a thinking behaviour which leads men towards the next phases of history. Progressive Writers Association was the combination of religious and secular progressives. Ahmed Nadeem Qasmi was a Muslim progressive. He used realism for his creative expression. Realism gave him a style and identity as well. He has never been a communist but his religious belief never became a hindrance for his progressivism.

میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسندی بذات خود کوئی فلسفہ نہیں بلکہ ایک فکری رویہ ہے جو کسی دوسرے رویے کے تضاد میں متشکل ہوتا ہے۔ یہ انسان کو فطرت اور سماج کی سنگینیوں اور جبریت سے نکال کر آگے کی طرف بڑھاتا ہے۔ گویا تاریخ کے پہیے کو اگلے مراحل کی طرف لے جانے کا نام ترقی پسندی ہے۔ آفاقی اقدار اور زمانی تقاضوں کی روح عصر کے مطابق تشریح اس فکری رویے کی تشکیل کرتی ہے۔ یوں ترقی پسندی ہر دور کا خاصہ ہے ۔تاریخ بتاتی ہے کہ پتھر کے دور سے کانسی، پھر پیتل اور لوہے کے ادوار کی طرف بتدریج بڑھنے والے ترقی پسند تھے۔ قدیم قبائلیت کے مقابلے میں جاگیرداریت اور جاگیرداریت کے مقابلے میں سرمایہ داریت کے حامی بھی ترقی پسند تھے۔ ہر عہد کے کچھ گروہوں نے آگے بڑھنے والوں کو کافر، غدار اور باغی کہا لیکن تاریخ کا کہنا ہے کہ یہ اپنے اپنے عہد کے ترقی پسند تھے۔ تاریخ کے پہیے کو کوئی نہ روک سکا اور ٹھہرنے والے کچلے گئے ۔تاریخ اس بات کی سرگوشی بھی کرتی ہے کہ ایک عہد کا ترقی پسند اگلے عہد کا رجعت پسند ہو جاتا ہے۔ جو وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی اجتہادی و تخلیقی صلاحیت نہیں رکھتے تاریخ انہیں مرگ مفاجات کی سزا سناتی ہے۔ انسان کے گذشتہ پانچ ہزار سالہ تہذیبی ماضی سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ کی بنیادی ترین حقیقت خود انسان ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ ٹھہراؤ پسند نہیں کرتا۔ شاید اسی لیے منٹو کو یقین تھا کہ انسان ہوتا ہی ترقی پسند ہے۔ یوں ماضی اور جمود پسند قوتوں سے نبرد آزما ہر نئے عہد کا ترجمان بطور شاعر، ادیب، فنکار، فلسفی، دانشور اپنا اپنا کردار ادا کرتا رہا۔

تاریخ اسلام کے اولین ترقی پسند خود آنحضرتؐ اور ان کی جماعت تھی جو اپنے فوری ہدف میں عرب کے غلام داری قبائلی نظام کے باغی تھے اور مولانا عبیداللہ سندھی کے بقول حضرت شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ نبی کریم ''کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قیصریت وکسرویت خاتمہ ہو۔انسانیت ان کے جور وستم سے آزاد ہو جس نے کہ عوام کو معاشی ،معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے روند ڈالا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی دگرگوں ہے۔''[۱] بعد کی تمام تر مسلم تاریخ ترقی پسند مسلمانوں اور رجعت پسند مسلمانوں کی کشاکش سے ہی آگے بڑھتی رہی۔ ہندستان کی تاریخ بھی کوروں پانڈوں سے لے کر تحریک آزادی تک ایسی ہی کشمکش کا اظہار ہے۔ گوتم بدھ سے بابا بلھے شاہ اور چار واک سے "Reconstruction of Religiouse Thought in Islam" تک یہاں لیفٹ کی ایک شاندار تاریخ رہی ہے جس میں گوناگوں افکار و مذاہب کے ترقی پسندوں نے اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے۔احمد ندیم قاسمی بطور ایک مسلم ترقی پسند اسی عظیم روایت کے نمائندہ تھے۔ ان کے عہد میں ترقی پسندی کی متعینہ معنویت کے تحت مختلف مذہبی اور سیکولر فکری دبستانوں سے تعلق رکھنے والے عناصر کے اتحاد سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل ہوئی تھی۔

اردو نظم اور ترقی پسندی کا آپس میں گہرا رشتہ رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں جو ترقی پسند شاعر اپنی وسیع تر پہچان اور قبولیت بنا سکے ان میں آج احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض ہی اہم ترین ہیں۔ قاسمی صاحب اپنی بے شمار جہتوں میں سے بطور تخلیقی فنکار جن اصناف سے داخلی طور پر ہم آہنگ تھے شعری سطح پر ان میں سے نظم ہی ایسی تھی جو حالی و اقبال کے بعد جدید تر فکری اظہار میں خاص ہوگئی تھی۔ سرسید و اقبال کی طرح ترقی پسندوں نے بھی اسے ہی شعری اظہار کا بنیادی وسیلہ بنایا تھا کیونکہ حالی و اقبال کے بعد ترقی پسند نہ صرف شعری سطح پر تہذیبی فکری روایت کا اگلا پڑاؤ تھے بلکہ بہت سے حوالوں سے اقبال کا تسلسل بھی تھے۔ کیونکہ فکری و قومی شاعری کے ساتھ ساتھ ''اقبال کا یہ انداز کہ 'کاخ امراء کے درو دیوار ہلا دو' ترقی پسندوں کے یہاں بہت نمایاں ہوا''[۲] ترقی پسندوں میں قاسمی صاحب نے اقبال سے خصوصی استفادہ کیا۔ جبکہ بقول جلیل عالی ''ترقی پسندوں کے گروہ میں اقبال کی اس روایت کا تسلسل سوائے ندیم کے کسی اور کے ہاں کم کم دکھائی دیتا ہے۔''[۳]

آغاز میں تو فیض صاحب اور قاسمی صاحب دونوں کا تعلق بلند آہنگ لہجے میں سیاسی ونظریاتی شاعری کے مقابلے میں ترقی پسندوں کے ''نرم اور مدھم لہجہ کی نیم رومانی اور نیم فکری شاعری جس میں رمزیت کا انداز نمایاں'' تھا کے شعری رجحان سے تھا۔[۴] جبکہ بقول شمس الرحمن فاروقی ۴۳ء کے لگ بھگ فیض کے رومانوی اور علی سردار جعفری کے بلند آہنگ ترقی پسند شعری رجحان کے مقابلے میں'' احمد ندیم قاسمی کا اسلوب شعران دونوں سے مختلف تھا اور اسے مقبول ہونے میں دیر لگی۔''[۵] بعد ازاں فیض صاحب اور قاسمی صاحب کے ہاں نمایاں ہوتی انفرادی شناختوں کا یہ اختلاف حقیقت نگاری اور رومانویت کی صورتوں میں ظاہر ہوا۔ گو خود فیض صاحب کے ہاں ابتدائی خواب آور دھندلی فضا بھی رومانوی انقلابی یہ آہنگ میں ڈھل چکی تھی۔ مگر ان کے لہجے میں پیدا ہونے والا انقلابی آہنگ ''بنیادی طور پر رومان زدہ احساسی لہجہ (ہی) تھا۔''[۶] انہوں نے'' اپنی منظومات میں رومانویت اور انقلاب کو گوندھ کر ایک پرسوز لیریکل انداز پیدا کیا۔''[۷]

ایک شاعر کے لیے حقیقت نگاری کی بنیاد پر شاعری کرنا ہماری شعری فضا اور روایت میں ایک خطرہ رہا ہے۔ کیونکہ رومانویت نے اردو قارئین و سامعین کی جمالیاتی نفسیات کا جو ڈھانچہ صدیوں میں تشکیل دے دیا ہے اس کے خلاف جا کر قبولیت حاصل کر لینا

مشکل کام ہے۔لیکن اگر پھر بھی کوئی ایسی ہمت کر رہا ہے تو وہ نہ صرف بہت حوصلے والا ہے بلکہ نظریاتی طور پر انتہائی پرخلوص بھی ہے۔ قاسمی صاحب نے یہ خطرہ مول لے کر یقیناً اپنے حوصلے اور خلوص کا اظہار کیا۔بقول انیس ناگی ’’احمد ندیم قاسمی شاعری میں تخیل کی بجائے استدلال کو بنیاد بناتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر شعریت اور نغمگی پرواز کر جاتی ہے احمد ندیم قاسمی کی بیشتر غزلیں (بھی) یہی واقعاتی اور منطقی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ جو اپنے طور پر اردو غزل کی روایت میں انفرادی جگہ نہیں بناتیں۔‘‘[8] آج اگر فیض صاحب لازوال شہرت کے عروج پر ہیں تو اس میں ان کی شاعری کے رومانوی رویے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔لیکن اس دوام کے باوجود انہیں محدود فکری وموضوعاتی دائرے میں رہنے کا الزام بھی سہنا پڑ رہا ہے۔حقیقت نگاری ترقی پسندوں کے فکری اظہار کی اساس تھی۔بہت آغاز ہی میں منٹو نے قاسمی کو لکھا تھا کہ ’’زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ وہ جیسی ہوگی یا جیسی ہونی چاہیے۔‘‘[9] شاید یہی بات انہوں نے ہمیشہ کے لیے پلے باندھ لی۔چونکہ بقول لوکاچ حقیقت نگاری کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ تخلیق کار’’ کا تخیل ،تعقل سے جا ملے۔‘‘[10] لہٰذا بقول صدیق کلیم ،قاسمی صاحب’’ذہن کو ماورائیت سے مادیت کی طرف رجوع‘‘[11] کرنے میں کوشاں رہتے ہیں یوں’’معروضیت ندیم کے فن کا قیمتی عنصر‘‘[12] بن گئی۔ قاسمی صاحب کی نظم نگاری میں اپنے کسی بھی ہم عصر ترقی پسند کے مقابلے میں ہر حوالے سے تنوع اسی کی دین ہے۔کیونکہ ان کے نزدیک’’ہم سے روح عصر کا مطالبہ تو یہ ہے کہ ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لائیں جو ہماری سرزمین پر سے گزر رہے ہیں۔‘‘[13] ان کی نظم میں اپنے عہد کی زندگی اور مسائل کے حوالے سے موضوعاتی رنگا رنگی کی شہادت تو ڈاکٹر قمر رئیس بھی دیتے ہیں بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ’’ان کے یہاں عظمت آدم کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بنی نوع انسان کے حوالے سے اقبال کی فکر سے آگے کی راہ دکھاتا ہے۔‘‘[14]

حیات وسماج کے زوال آمادہ مظاہر کی ناقدانہ تصویر کشی کے حامل شہر آشوب اور حالی وشبلی کی وطن پرستی وآزادی کی حامل نظم نگاری کے بعد یہ ترقی پسند ہی تھے جنہوں نے سماجی تبدیلی کی حامل قوتوں کی نشاندہی کے علاوہ قومی، عالمی اور عوامی تحریکوں کے ساتھ مل کر ایک نئی انسانی یک جہتی کے تصور کے ذریعے اردو نظم کو ارتقا کے اگلے مرحلے میں داخل کیا۔اقبال اس سلسلے کی اہم کڑی تھے۔لیکن لفظیات اور امیجری کے حوالے سے نظم کو غزل سے آزاد کروانے میں قاسمی صاحب کا حصہ بہت زیادہ ہے۔یہ بھی ان کی حقیقت نگاری کا خاصہ تھا اور اپنے قاری کو محدود کرنے کا خطرہ مول لے کر روایتی غزلیاتی جمالیات سے دامن چھڑانے کا یہ حوصلہ مند تجربہ یقیناً اہم ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں فیض صاحب اپنی رومانیت پسندی کے تحت اردو غزل کی جن لفظیات سے استفادہ کر رہے تھے وہ یقیناً ملائمیت ،غنائیت اور استاد سودا کی طرح کے ایک خاص طنطنے کے باعث ان کی قلمرو کو وسیع تر کرنے میں معاون رہے۔لیکن پاکستانی اردو زبان کا ارتقا مختلف اللسان عوامی طبقات کے زیر اثر جس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اس میں فارسیت پسند اردو کا احیا خود بھی ایک رومانوی رویہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک ’اردو سپیکنگ‘ کی بجائے ’اردو یوزرز‘ کے نظری،تہذیبی ،سماجی سیاسی اور ثقافتی’’ باہمی تعامل سے اب تک اردو کا ایک نیا لہجہ،منفرد آہنگ اور جدا اسلوب وضع ہو چکا ہے۔‘‘[15] بقول فتح محمد ملک’’جب پاکستانی اردو کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد اس اردو زبان سے ہوتی ہے جو پاکستان کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو ہماری (پاکستانی) سماجی، معاشرتی نیز تہذیبی روایات کا حصہ ہے۔‘‘[16] قاسمی صاحب نے دیہی وعوامی لہجوں اور لفظیات کی آمیزش سے اپنی نظموں کی جو زبان تشکیل دی وہ ان کی ترقی پسندی ہی کی ایک جہت ہے،جس میں ان کی دیہی زندگی کی زبان اور تجربات نے اپنی سادگی ، ابلاغ اور عوامی قربت کے ذریعے نئے لہجے، ذخیرہ الفاظ ، کیفیات اور آہنگ کے حوالے سے اہم

کردار ادا کیا ہے۔ رئیلزم سے انحراف لامحالہ رومانس سے جڑت کی بنیاد بنتا ہے ۔لیکن ہر حقیقت نگاری کی اپنی ایک جہت ہوتی ہے جیسے مجید امجد کے ہاں یہ انفعالیت کا شکار ہے اور فیض کے ہاں اس کے عناصر ایسی فضا بناتے ہیں جس سے تصویر دھندلی دھندلی سی رہتی ہے۔ اس سب کا اثر شعری زبان اور امیجز پر بھی پڑتا ہے لہذا جب بھی dynamic or active realism کی طرف حرکت ہوگی تو پھر آنا تو قاسمی صاحب کی نظمیہ زبان کی طرف ہی پڑے گا جوان کی نظموں میں زندگی کی رنگ برنگ تصویریں نت نئے زاویوں سے سامنے لاتا ہے۔

فیض کی رومانیت ان کے سماجی آئیڈیل اور شخصی آئیڈیل کو بار بار آمیخت کرتی ہے ۔ ان کا انقلاب، ان کا نظریہ، ان کا وطن اور پھر ان کا محبوب سب بار بار یوں ایک ہوتے چلے جاتے ہیں کہ ان کو الگ الگ پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے۔لیکن قاسمی صاحب کی حقیقت نگاری ان کی نظم میں ان کے شخصی و سماجی آئیڈیل کا آمیزہ نہیں بننے دیتی کیونکہ ''وہ انفرادی احساسات کو کم سے کم اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔''[۷] البتہ غزل کی جبریت کہیں کہیں شعر میں یہ رنگ لے آتی ہے جیسے:

انداز ہو بہو تیری آواز پا کا تھا

دیکھا نکل کے تو کوئی جھونکا ہوا کا تھا

یہاں انقلاب اور محبوب دونوں ایک ہی معنویت میں پروئے گئے ہیں۔لیکن جب یہ خوبی کثرت کے ساتھ فیض صاحب کے ہاں انگریزی شاعری کے زیر اثر استعارہ بالکنایہ کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے تو ان کے رومانوی رنگ کو مزید گہرا کر دیتی ہے جیسے ''دل کے رخسار پر رکھا ہے تیری یاد نے ہاتھ۔۔۔'' رومانیت کا یہی پہلو جب شخصی آئیڈیل کے حوالے سے حاوی ہوتا ہے تو عمومی طور پر فریق محبت کے ساتھ مساویانہ طرز عمل کے باوجود ہجر ووصال کے مرحلوں میں شاعر کی اپنی کیفیات و پیچیدگیوں کا اظہار تو بارہا ملتا ہے لیکن فریق ثانی کے متعلق ایک بے خبری سی رہتی ہے۔ یہاں بھی قاسمی صاحب کی حقیقت نگاری محبوب کو محض ایک بت کے طور پیش کرنے کی بجائے جاندار، متحرک اور برابر کی سطح کا جانتے ہوئے اس کے داخلی و خارجی اظہارات کا ترجمان بھی بنتی ہے۔

فیض صاحب اور قاسمی صاحب میں سے کسی ایک کے محبوب تر ہونے کے حوالے سے پاکستانی لیفٹ کی اپنی ترجیحات رہی ہیں ۔جبکہ ان دونوں شخصیات کی تھیوریٹیکل اور آئیڈیالوجیکل لائن ایک ہی تھی۔ دونوں پاکستانیت اور مسلم نیشنلزم کے پکے حامی تھے اور دونوں مارکسی ترقی پسند نہیں بلکہ مسلم ترقی پسند تھے۔ یہ الگ بات کہ شخصی جہات وتحرک کے حیران کن توازن کی مثال قاسمی صاحب نے دھیمے اور شاعرانہ سست روی کے حامل کم گو فیض صاحب کے مقابلے میں ان نظریاتی موضوعات پر براہ راست لکھا اور بے شمار لکھا۔ یوں بھی قاسمی صاحب زیادہ vocal تھے اور نثر نگار تو وہ تھے ہی۔ ہاں البتہ فیض صاحب کی مارکسیوں اور سیکولر اشتراکی ترقی پسندوں سے قربتیں اور دوستیاں زیادہ رہی تھیں پھر لینن پیس پرائز الگ سے۔ مگر بطور مسلم ترقی پسند دونوں بزرگوں کی شاعری میں مذہبی عناصر انتہائی نمایاں ہیں۔ دونوں محض ڈیموکریٹ نہیں بلکہ ترقی پسند عوام دوست ڈیموکریٹ ہیں۔ دونوں اشتراکی تخلیق کار نہیں بلکہ عدل، مساوات اور آزادی جیسی آفاقی اقدار کے شارح ہیں جنہیں وہ اسلامی علامتوں، استعاروں اور دیگر فکری و ادبی عناصر کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ترقی پسند تحریک کی معاشی ناہمواری کے خلاف جدوجہد سے میں بہت متاثر ہوا اور اس سے میرے عقائد پر کوئی زد بھی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے اس کی رکنیت قبول کی ۔ اس کے عہدوں پر فائز رہا اور آج بھی کہتا ہوں کہ میں ترقی

پسند ہوں۔۔۔میں کیمونسٹ کبھی نہیں رہا اور اس کی وجہ میرے اردگرد پھیلا ہوا مذہبی ماحول تھا۔۔۔میں خدا کا منکر نہیں ہوں اور رسول کریم کو خاتم النبین مانتا ہوں۔۔۔جو ادیب بھی طبقاتی کشمکش اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہو میں اسے ترقی پسند سمجھتا ہوں ۔[۱۸]

۱۹۹۷ء کے اپنے ایک خط میں قاسمی صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ:

ترقی پسندوں پر' الزامات' میں سے ایک الزام تو ان کی سوویت روس پسندی تھا اور میں نے روسی امپریلزم کی ہمیشہ مخالفت کی کہ روس نے کشمیر کو ہمیشہ بھارت کا حصہ قرار دیا اور پاکستان پر حملوں کے لیے روس بھارت کے ہوا بازوں کی تربیت کرتا رہا۔ دوسرا الزام یہ ہوسکتا ہے کہ دوسرے ترقی پسند دوست الحاد کی طرف مائل تھے مگر میں خدا کی حمد اور رسول کی مدحت کرتا تھا اور یہ وہ مقام ہے جہاں میں نے سجاد ظہیر مرحوم اور سبط حسن مرحوم سے بھی اختلاف کیا تھا ۔چنانچہ میں نے کیمونسٹ پارٹی کی رکنیت قبول نہ کی۔ میں نے دوسرے ترقی پسند دوستوں کی رفاقت اس لیے اختیار کی کہ میں بھی ان کی طرح صدیوں کے جبر اور غلامی اور ذلت اور انسان کی بے وقری کا مخالف تھا اور کچلے ہوئے عوام کو خود آگاہی اور خودنگری کی طرف مائل کرنا چاہتا تھا ۔[۱۹]

ایک اور خط میں انہوں نے لکھا کہ'' میں نہ کیمونسٹ ہوں، نہ مارکسسٹ ہوں اور نہ سوشلسٹ ہوں۔ا یک سیدھا سادا مسلمان ہوں اور

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اٹھتا ہوں
بس یہ خامی ہے مرے طرز مسلمانی میں''[۲۰]

منٹو کا کہنا تھا کہ'' کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے ۔یہ کیا بے ہودگی ہے۔سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے''[۲۱] اس کے ساتھ ہی قاسمی صاحب کے ممدوح اور نظریاتی رفیق پروفیسر فتح محمد ملک کا ایک جملہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ''میں خود کو ترقی پسند سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان اس کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا''[۲۲] اس جملے کی اس خوبی کے علاوہ کہ اسے اگر الٹا کر پڑھیں تو بہت سے ترقی پسندوں کا احترام دل میں جاگزیں ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی بہت سے مسلمانوں کا احترام دل سے جاتا بھی ہے، یہ جملہ قاسمی صاحب کی مسلم ترقی پسندی کی بنیاد بھی ہے جس کی قومی سطح پر وضاحت وہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''اگر آج بھی ہم اپنے افکار و خیالات کو تخلیق و اجتہاد سے روشناس کردیں اور اس جرأت مندانہ اجتہاد کے ذریعے اسلامی تہذیب کو ایک جیتی جاگتی ، سانس لیتی اور دھڑکتی ہوئی تہذیب بنادیں جس کے باطن میں بڑی فراخی ہو اور جس کے ظاہر میں جلال و جمال برابر برابر تناسب سے جلوہ گر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ پوری دنیا پاکستان کو اسلامی تہذیب کی تجسیم نہ کہنے لگے۔''[۲۳]

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، سرسید سے اقبال تک،لاہور،فکشن ہاؤس ،۲۰۱۰ء،ص۱۶۰

۲۔ قمر رئیس ،ڈاکٹر،عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب،لاہور، مکتبہ عالیہ،۱۹۹۴ء،ص۴۷۹

۳۔ جلیل عالی،ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں مشمولہ سہ ماہی ادبیات ، جلد۱۷،شمارہ ۷۳، اسلام آباد ، اکادمی ادبیات پاکستان،ص۱۱۳

۴۔ قمر رئیس ،ڈاکٹر،عاشور کاظمی،ص۴۷۸

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی،''قاسمی صاحب''مشمولہ سہ ماہی ادبیات ،ص۲۴

۶۔ قمر رئیس ،ڈاکٹر،عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب،ص۴۷۹

۷۔ انیس ناگی، پاکستانی ادب کی تاریخ،۲۰۰۴، لاہور، جمالیات،ص۷۰

۸۔ انیس ناگی،ڈاکٹر، پاکستانی ادب کی تاریخ،۲۰۰۴، لاہور، جمالیات،ص۷۷

۹۔ احمد ندیم قاسمی،منٹو کے خطوط، لاہور، کتاب نما،۱۹۶۲ء،ص ۲۷

۱۰۔ مظفر علی سید، افسانہ ساز منٹومشمولہ سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ، مرتب ڈاکٹر انیس ناگی، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء ص۴۷

۱۱۔ صدیق کلیم، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد پنجم، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۹

۱۲۔ انور سدید،ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور،عزیز بکڈ پو ،۲۰۰۶ء،ص۴۴۴

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب وفن، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء،ص ۲۵

۱۴۔ قمر رئیس ،ڈاکٹر،عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب،ص۴۸۲

۱۵ عطش درانی، ڈاکٹر، پاکستانی اردو،اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۸ء،ص۷۰

۱۶۔ عطش درانی، ڈاکٹر، پاکستانی اردو،ص۱۷

۱۷۔ انیس ناگی، پاکستانی ادب کی تاریخ،ص۷۶

۱۸۔ اردو کے قدآور ادیب احمد ندیم قاسمی (مرحوم) کے منفرد خیالات، انٹرویو، اصغر عبداللہ، مونتاج، نذر ندیم، شمارہ ۱ جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء، شمارہ ۲ مئی تا اگست ۲۰۰۷ء،ص ۱۷۱۔۲۱۶

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی بنام راقم،۱۱جولائی۱۹۹۹ء

۲۰۔ احمد ندیم قاسمی بنام راقم،۱۷جنوری۱۹۹۷ء

۲۱۔ سعادت حسن منٹو،منٹو نامہ، لاہور،سنگ میل پبلیکیشنز،۱۹۹۵ء،ص۶۱۶ ۔

۲۲۔ فتح محمد ملک،تعصّبات، لاہور، سنگ میل، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۔

۲۳۔ اسلامی تہذیب پاکستانی تخلیقی فنکار اور اجتہادمشمولہ سہ ماہی فنون، خاص شمارہ ندیم نمبر، مدیر حیات قاسمی ڈاکٹر ناہید قاسمی، شمارہ ۱۲۸، دسمبر ۲۰۰۸ء تا دسمبر ۲۰۰۹ء، لاہور،ص ۱۳۸